فرار کے بہت سے واقعات آپ نے اس سے پہلے پڑھے ہوں گے۔ مگر یہ واقعہ ان سب میں سب سے عبرت انگیز، ہولناک اور لرزہ خیز ہے۔ اسی لئے میں نے اسے ترجمہ کے لئے منتخب کیا۔ افسوس ہے کہ فراری مصنف کی واضح تصویر فراہم نہ ہو سکی چنانچہ پہلے سے چھپی ہوئی تصویر کو ہی یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

اس شخص کو غور سے دیکھئے۔ یہ اپنی زندگی میں ناقابل یقین حادثوں سے گزرا ہے۔ (شفیق نرسیدی)

اِس ماہ کی خاص کہانی

کاربیرے

رات کے ۹ بجتے ہی بندرگاہ کی فضا میں سائرن کی آواز بلند ہوئی۔ چار گھنٹے کا اوور ٹائم ختم ہو گیا گودی پر کام کرنے والے مزدوروں نے کام کرتے کرتے اپنے ہاتھ روک لئے۔ میں نے بھی لوہے کا آنکڑا اپنی پیٹی میں اڑسا، اوور ٹائم کے پیسے وصول کئے اور گھر کی طرف چل دیا۔

آج میں بہت خوش تھا۔ ۱۹۳۳ء میں دنیا کے اور ملکوں کی طرح فرانس بھی معاشی بحران سے دوچار تھا۔ اس زمانے میں مارسیلیز کی بندرگاہ پر ایک گھنٹے کام کرنے کا مطلب یہ تھا جیسے کسی کو زمین پر پڑا ہوا روپیہ مل جائے۔

میں نے سوچا یہ رات میں اپنی بیوی کے ساتھ تفریح میں گزاروں گا۔ رات بڑی خوبصورت تھی۔ ساحل پر لوگوں کا ہجوم تھا میں نے ذہن میں گھر سے باہر رات گزارنے کا پروگرام مرتب کیا۔ پہلے ہم رقص گاہ جائیں گے۔ وہاں موسیقی کی دھیمی دھیمی لہروں پر رقص کریں گے، شیشۂ و جام چھلکائیں گے اور صبح دم جب گھر واپس لوٹیں گے تو ایک دوسرے کی باہوں میں سمٹ کر سو جائیں گے۔

جب میں گھر پہونچا تو وفور مسرت سے تین تین چار چار سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچا لیکن اچانک جھجک کر رک گیا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دل میں یکایک بہت سے خدشوں نے سر ابھارا۔ دبے دبے قدموں میں اندر داخل ہوا تو جیسے ذہن کے اندر ایک آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میری، میری بیوی کسی اور مرد کی آغوش میں تھی وہ بالکل برہنہ بستر پر پڑے ہوئے تھے اور میری شدت جذبات سے کراہ رہی تھی۔ یہ وہ کراہیں تھیں جن کو اب تک میں صرف اپنے لئے سمجھتا تھا۔

ایک مکڑی سی تھی جو میرے سامنے جالا تان رہی تھی اور جالے سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور پھر میں نے پیٹی سے آنکڑا نکال کر ہاتھ میں لہرایا اور بھوکے عقاب کی طرح اندر جھپٹا۔ میرے قدموں کی دھمک سن کر دونوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ان میں ایک میری بیوی اور ایک دوست تھا۔ حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں پھٹ گئیں اور چہرے زرد پڑ گئے۔ پھر میرے اندر احساس کی قوتیں فنا ہو گئیں اور جب دوبارہ میں اپنے آپے میں آیا تو دو لاشیں خون میں

https://www.facebook.com/groups/372605677178945/?ref=share&mibextid=KtfwRi

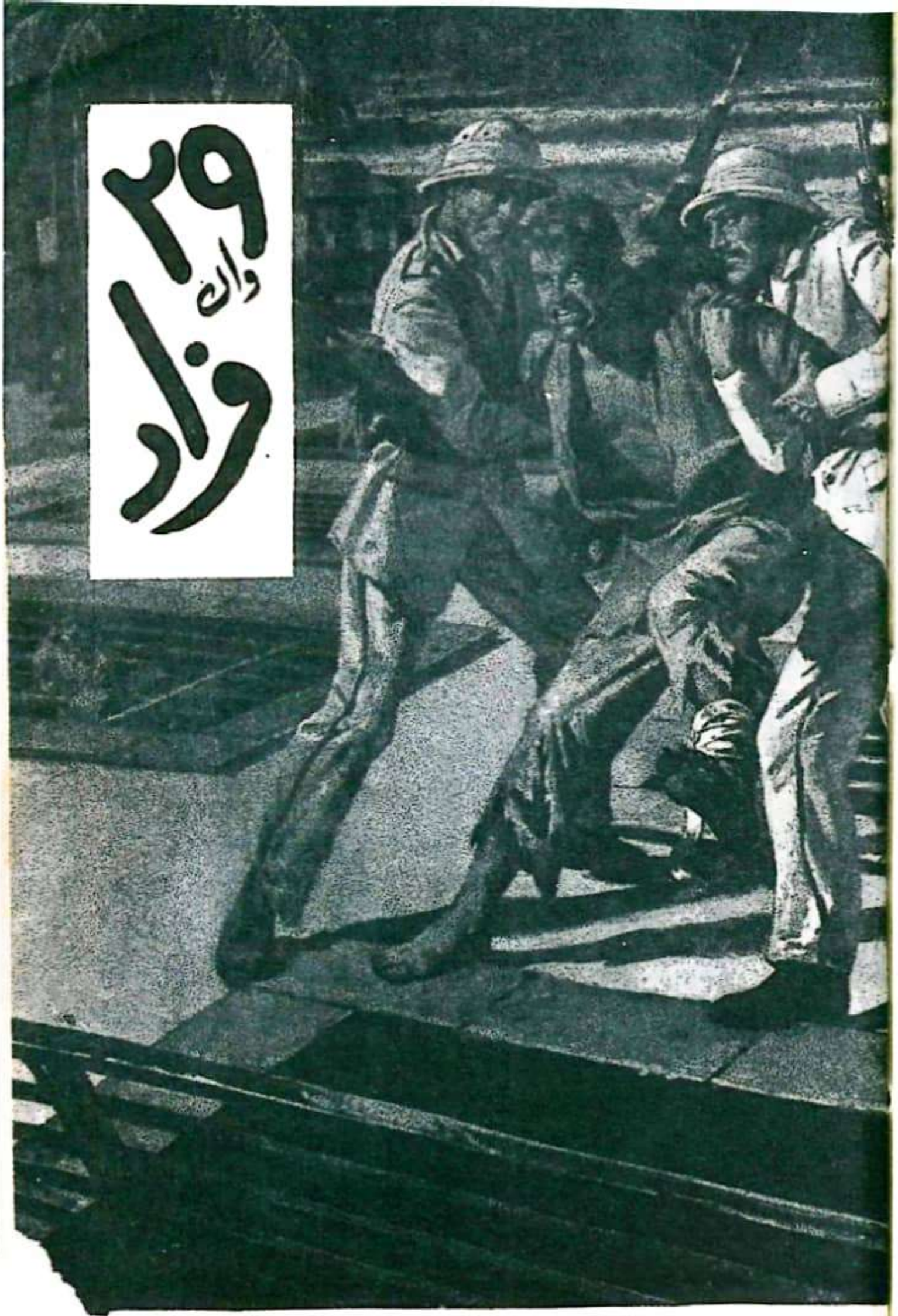
۲۹
واں
فرار

لت پت میرے قدموں میں پڑی تھیں۔ میں نے ان پر ایک نفرت انگیز نظر ڈالی اور گھر سے باہر نکل آیا۔

لیکن جیسے میں سڑک پر تنہا تھا، جیسے میرے آس پاس لوگ نہیں تھے، جیسے روشنی نہیں تھی اور اندھیرا بھی نہیں تھا، بس ایک خلا تھا اور میں خلاؤں میں قدم رکھ رہا تھا۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں دو سپاہیوں کی گرفت میں تھا لوہے کا آنکڑا ابھی تک میرے ہات میں تھا اور تازہ تازہ لہو اُس پر ابھی تک جمنے نہیں پایا تھا۔

میں جیل گیا، عدالت لیجایا گیا۔ جج نے مجھے قتل عمد کا مجرم ٹھہرایا لیکن گلوٹین پر بھیجنے کی بجائے اس نے مجھے دس سال قید سخت کی سزا دی اور شیطانی جزیرے پر بھیج دینے کا حکم صادر کیا۔ شیطانی جزیرے کا دوسرا نام بے رحم اور تکلیف دہ موت تھا، ایسی موت جو رفتہ رفتہ آتی ہے اور جسم کو دیمک کی طرح چاٹتی چلی جاتی ہے۔

سال میں دوبار" لا میرینرے" جہاز قیدیوں کو مارسیلیز سے لیکر شیطانی جزیرے کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ مجھے بھی ایک ہزار دوسرے قیدیوں کے ساتھ مویشیوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر اس جہاز پر پہنچا دیا گیا اور بیس بیس کی ٹولیوں میں بانٹ کر بند کیبنوں میں ٹھونس دیا گیا۔ وہاں ہمارے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں کھولدی گئیں۔ کیبن کی چھت سے لوہے کے موٹے موٹے پائپ لٹک رہے تھے اگر قیدی بغاوت کردیں تو یہ پائپ جلتی ہوئی بھاپ کے بادل اُگلنے لگتے ہیں۔ کیبن میں صرف ایک چھوٹا سا پورٹ ہول تھا۔ آپ اسے روزن بھی کہہ سکتے ہیں اسی روزن سے معلوم ہوتا تھا کہ دن کب ختم ہوا اور رات کب شروع ہوئی۔

جب ہم فرانسیسی گیانا کے سرسبز و شاداب ساحل پر پہنچے تو آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ پورٹ ہول سے ہم نے پہلی بار اُن بکھرے ہوئے جزیروں کو دیکھا جو ہمارے زنداں تھے سائینے شہر کے مکانوں کی سُرخ چھتیں گیلے خون میں بھیگی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اس سے پرے جنگل کے اوپر چڑیوں کے غول اُڑ رہے تھے۔

سنتری ہمیں بیس بیس کے گروہوں میں لوہے کی بھاری زنجیروں میں جکڑ کر ڈھور ڈنگر کی طرح ہانکتے ہوئے عرشے پر لے گئے۔ جب ہم گودی پر اترے تو سپاہیوں کی ایک فوج چاروں طرف پوزیشن سنبھالے تھی ان کے درمیان سے گزر کر ہمیں ایک ایسے احاطے میں ڈھکیل دیا گیا جہاں کوئی سائبان نہ تھا اور جہاں چاروں طرف لوہے کی خاردار اونچی اونچی باڑھیں لگی تھیں۔ ہمارے سروں کو مونڈھ کر ہمیں اس احاطے میں چھوڑ دیا گیا جہاں تپتی ہوئی زمین پر قیدی کھڑے تھے، بیٹھے تھے، اور لیٹے تھے، لیکن سب نڈھال تھے۔

جوں جوں سورج بلند ہوا گرمی شدید ہوگئی تپتی ہوئی آہنی زنجیروں نے جسموں پر آبلے ڈال دیئے۔ ہم لوگ کراہنے لگے لیکن شام ہوتے ہوتے کراہنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ جزیرے کی سختیوں کا پہلا دن ہی بڑا سخت ثابت ہوا۔ شام کو ہمیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر سوار کرکے قید خانوں میں پہنچا دیا گیا۔ کشتیاں کھینے والے بھی قیدی ہی تھے جو غلاموں سے بھی بدتر تھے، وہ بھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور چپو ان کے ہاتھوں سے بندھے ہوئے تھے۔

زیادہ تر قیدیوں کو سینٹ لارین لے جایا گیا، جہاں دریائے ماروئی کے کنارے اصل قید خانہ واقع تھا۔ سینٹ

لارین جزیرہ، سینٹ جوزف، رائل اور دوسرے شیطانی جزیروں سے مختلف تھا۔ یہ سب جزیرے باہم ملکر شیطانی جزیرے کہلاتے تھے۔ خاص شیطانی جزیرے پر صرف سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے۔ رائل میں ۴۰۰ قیدی، سینٹ جوزف میں ۴۰۰ قیدی اور سائینے شہر میں دو ہزار ایسے قیدی جنھیں تھوڑی بہت آزادی ہوتی تھی، رکھے جاتے تھے۔

سینٹ لارین قید خانے کو بے انتہا بلند اور پتھر کی مضبوط دیواریں گھیرے ہوئے تھیں۔ شیطانی جزیرے کے زیادہ تر سنتری، موٹے تازے لال بھبوکا، خوفناک چہروں اور گہری چمکیلی آنکھوں والے کارسیکی تھے۔ یا کچھ الجیریائی اور یہ سب فرانسیسیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کے ہاتھوں میں کوڑے اور ڈنڈے ہوتے تھے جنھیں یہ بے تحاشا قیدیوں پر برساتے رہتے تھے لیکن بعد میں جب چند چھوٹی موٹی اصلاحات نافذ ہوئیں تو کوڑوں کا... استعمال بند ہوگیا۔

سینٹ لارین میں ہمیں اسی اسی کے گروہوں میں تقسیم کرکے فوجی بیرکوں جیسی عمارتوں میں منتقل کر دیا گیا یہاں ہمارے جسموں سے زنجیریں کھول دی گئیں۔ ہر بیرک سو فٹ لمبی اور بیس فٹ چوڑی تھی یہاں اوڑھنے اور بچھانے کے لئے صرف ترپالیں تھیں۔ سورج ڈوب رہا تھا لیکن دن بھر کی تپتی ہوئی دیواروں نے بیرک کو بھٹی کی طرح گرم کر دیا تھا سر پر گرم لوہے کی چھت اور زیادہ تکلیف پہنچا رہی تھی۔ ہمارے جسموں سے پسینے کی ٹلیاں چھوٹ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد محافظوں کی نگرانی میں چند قیدی پتلے پانی جیسے سوپ سے بھری بالٹیاں اور روٹیوں سے لدی ہوئی ٹوکریاں لیکر اندر آئے۔ انھوں نے ہمیں ٹین کا ایک ایک پیالہ

پکڑا دیا۔ بس یہ ہمارا کھانا تھا۔ ہر بستر کے پاس ایک ایک بالٹی رکھی تھی۔ رفع حاجت کے لئے اس سے بہتر اور کوئی چیز نہ تھی۔ اس سے ایک "فائدہ" یہ ہوا کہ جن کو اب تک پیچش نہیں تھی ان کو پیچش ہو گئی۔ پیچش بڑی بُری بلا ہے، جو جسم کو رفتہ رفتہ گھلا دیتی ہے صرف بہت مضبوط اور توانا قیدی ہی اسکے حملے سے بچ پاتے ہیں لیکن وہ بھی محض ہڈیوں کا ڈھانچا رہ جاتے ہیں۔

جب میں ۱۰ اگست ۱۹۳۳ء کو "لامیریزے" جہاز پر سوار ہوا تھا تو میری عمر ۳۱ سال، قد پانچ فٹ گیارہ انچ اور وزن ۱۸۰ پونڈ تھا۔ لیکن جب میں سات سال بعد آخری بار شیطانی جزیرے سے فرار ہوا تو میں ۳۸ سال کی بجائے ساٹھ سالہ بوڑھا معلوم ہوتا تھا اور میرا وزن صرف سو پونڈ تھا۔

شیطانی جزیرے سے پہلی بار میں نے صرف ایک ہفتے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس روز ہم درختوں کا ایک کنج کاٹ رہے تھے تاکہ سڑک گزرنے کے لئے جگہ نکل سکے۔ کام کرتے وقت ہم پابہ زنجیر نہیں تھے اور آٹھ قیدیوں پر صرف ایک محافظ تعینات تھا۔ اچانک ایک سانپ نے کسی قیدی کو کاٹ لیا اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔ میرے علاوہ تمام قیدی اور ساتھ ہی ساتھ تمام محافظ دوڑ کر اس کے پاس پہنچے۔ اوپر درختوں میں بندر اور طوطے شور مچا رہے تھے۔ میں چپکے سے ایک جھاڑی میں سے بھاگ نکلا اور پھر بھاگتا ہی چلا گیا تقریباً بیس منٹ بعد میں نے تین بار توپ کے دھماکے سُنے۔

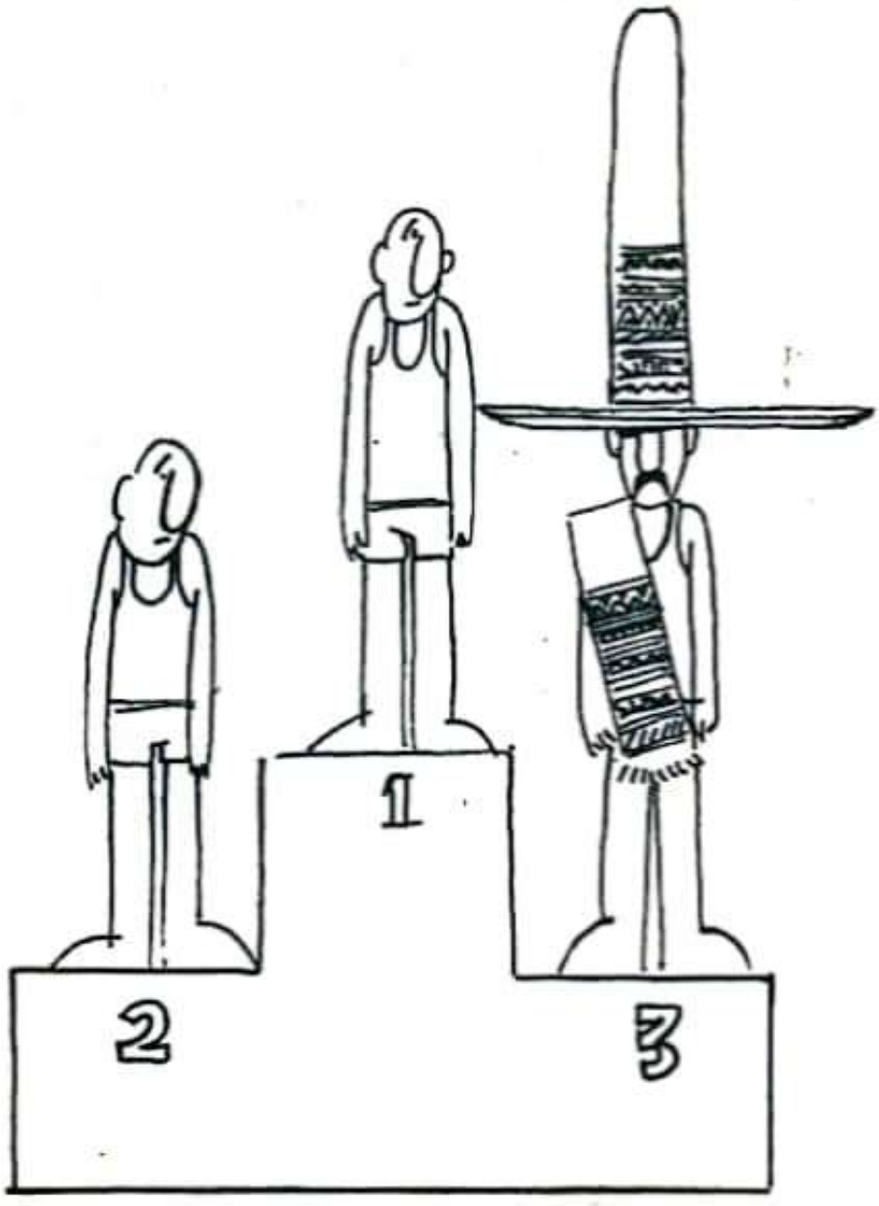

اس کا مطلب تھا کہ سنتریوں کو میرے فرار کا علم ہوگیا اور وہ توپ داغ کر آس پاس کی بستیوں کو میرے فرار کی اطلاع دے رہے تھے۔

میں جنوب کی سمت دوڑ رہا تھا۔ کبھی مجھے کیچڑ میں سے گزرنا پڑا، کہیں خاردار جھاڑیوں نے میرے لباس کو تار تار کیا لیکن میں ایک لحظے کے لئے نہیں رُکا۔ میرا رُخ برازیل کی سرحد کی طرف تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے پہاڑوں کے سلسلے عبور کرنے ہوں گے، جنگلوں سے گزرنا پڑے گا اور راستے میں اپنے لئے غذا بھی تلاش کرنا ہوگی، لیکن میں بھاگتا رہا۔ میرے ساتھی قیدیوں نے مجھے ایک درخت کے متعلق بتایا تھا جس کے تنے میں سوراخ کرنے سے میٹھا پانی پینے کو مل جاتا تھا۔ انھوں نے مجھے آم اور امرود جیسے چند جنگلی پھل کھانے سے منع کیا تھا کیونکہ وہ زہریلے ہوتے تھے، انھوں نے مجھے درندوں، سانپوں اور وحشی قبیلوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید بھی کی تھی۔

رات ہوتے ہوتے مجھے معلوم ہوگیا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے۔ ایک بار پرانے قیدیوں نے بتایا تھا کہ اگر کوئی قیدی بھاگ جاتا ہے تو دشوار گزار راستوں کے پیش نظر اسے مردہ تصور کر لیا جاتا ہے اور اس راستے سے تو اب تک کوئی بھی قیدی فرار نہیں ہوا تھا۔

جب میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا تو سانس لینے کے لئے تاڑ کے ایک درخت کا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا اور اس سے کہا۔

"تم میرے بڑے اچھے دوست ہو۔ تم بھی اور یہ تمام جنگل بھی۔" میں نے سوچا کہ قید میں زندگی گزارنے سے بہتر یہ ہے کہ جنگل میں مر جایا جائے۔ فطرت میری دوست تھی اور انسان دشمن۔ کم از کم پہلی بار میں نے یہی سوچا تھا۔

رات گزارنے کے لئے میں نے ایک درخت کی شاخوں میں اپنے لئے جگہ بنالی۔ صبح سویرے تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا بایاں پیر بُری طرح سوج گیا تھا۔ شاید کسی زہریلے کیڑے یا سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ساری ٹانگ میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے درخت سے اترنا چاہا لیکن اپنے پیر کو جنبش بھی نہ دے سکا۔ اسی کوشش میں ایکا ایک دھم سے نیچے زمین پر جا پڑا۔ تکلیف سے میری چیخیں نکل گئیں۔ بہت دیر تک میں یونہی پڑا رہا۔ جب اپنے اعصاب اور درد پر مجھے تھوڑا سا قابو حاصل ہوا تو درخت کا سہارا لیکر کھڑا ہوا۔ اب آگے جانا بیکار تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ شیطانی جزیرے پر واپس جاؤں۔ شاید قید خانے کا ڈاکٹر مجھے موت سے بچالے۔ بچ گیا تو پھر فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ یقین جانئے کہ فرار ہونے کا یہ خیال ہی مجھے واپس قید خانے لے گیا ورنہ میں یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجانے کو ترجیح دیتا۔ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کو بیساکھی بنا کر اور صرف ایک پیر پر زور ڈالتا ہوا میں اپنے صیاد کی طرف چل دیا جنگل میں بندر میرا مونہہ چڑا رہے تھے اور طوطے قہقہے لگا رہے تھے۔ ہر ہر قدم پر تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکل جاتی تھی جو فاصلہ میں نے صرف دو گھنٹے میں طے کیا تھا وہ اب سارے دن میں طے کیا۔

سنتری مجھے قید خانے کے کمانڈر کے پاس لے گئے اور اس نے مجھے فوراً ہی سزا سنادی۔ وہ ایک بوڑھا کرنل تھا شراب نے جس کے رخساروں میں آگ بھر دی تھی۔

"قیدی کا بچہ!" اس نے سختی سے کہا "جس طرح محافظوں کا فرض تم پر نگاہ رکھنا ہے اور جس طرح میرا فرض تمھیں سزا دینا ہے، اسی طرح فرار ہونا تمھارا بھی فرض ہے لیکن فرار میں ناکام ہونے کی صورت میں تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ شیطانی جزیرے سے بھاگنے کی سزا یہ ہے کہ تم

تین سال ریچھ کے بھٹ میں گزارو اور کان کھول کر سن لو۔ اگر اس بار فرار ہونے کی کوشش کرو تو ناکام مت ہونا۔"

ریچھ کے بھٹ پنجرے نما کال کوٹھریوں کو کہا جاتا تھا اور یہ جزیرہ سینٹ جوزف پر واقع تھیں۔ یہ کوٹھریاں بارہ فٹ طویل سات فٹ چوڑی اور بارہ فٹ اونچی مضبوط دیواروں پر مشتمل تھیں ان کی چھت آہنی سلاخوں کے جال سے بنی ہوئی تھی اور اسی چھت کے ذریعے مجرموں کو نیچے اتارا جاتا تھا۔ چھت میں کھانے کی بالٹیاں نیچے لٹکانے اور مجرموں کو اندر پہنچانے اور نکالنے کے لئے آہنی سلاخوں میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ کوٹھریوں میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ چھت پر سنتری ٹہلتے رہتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھانک کر پنجرے میں بند مجرموں پر نگاہ بھی ڈال لیتے تھے۔ پنجروں کے اوپر ایک کافی اونچا ٹین کا سائبان تھا جو سورج کی تپش سے آگ ہو جاتا تھا اور جس کی تپش پنجروں میں بند قیدیوں کو شدید اذیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ یہاں پانچ سائبانوں کے نیچے ایسی اسّی کال کوٹھریاں تھیں۔ قیدی کو کوٹھری میں ایک چھ فٹ لمبی لکڑی کی بنچ، ایک کمبل اور دو چوبی بالٹیاں ملتی تھی جن میں سے ایک کھانے پینے اور دوسری رفع حاجت کے کام آتی تھی۔ جب مجھے پنجرے میں ڈالا گیا تو میں نے دوسرے پنجروں میں بند قیدیوں کو بالکل پاگل محسوس کیا۔ یہاں کبھی گریہ وزاری کی صدائیں بلند ہوتیں اور کبھی مجنونانہ قہقہے فضاؤں کو جھنجھوڑ دیتے۔ اور جب دو پاگل اپنے اپنے پنجروں کی آہنی سلاخوں میں سے گردن نکال نکال کر ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھی پاگل ہونے والا ہوں۔

شمی کا کہنا ہے کہ تمہاری آنکھیں نیلی ہیں ـــــ کیا یہ سچ ہے گڈو ـــــ ؟

ریچھ کے بھٹوں سے نکلنے کی صرف دو صورتیں تھیں۔ یا تو قید کی میعاد پوری کرنے پر یا پھر بیمار ہو کر مرجانے کے بعد۔ یہاں سے فرار ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ قیدی اکثر و بیشتر بیمار بن جاتے تھے تاکہ، چاہے گھنٹا بھر کے لئے ہی سہی، وہ ان کوٹھریوں سے باہر نکل سکیں اور کچھ وقت قید خانے کے اسپتال میں گزار سکیں۔ بیمار پڑنا بہت آسان تھا بس بازو کی کھال کو تھوڑا سا کھرچنا پڑتا تھا، اور اس پر کچھ گندگی ملنی پڑتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ معمولی سا زخم بھی جلد ہی پک جاتا تھا۔ تکلیف کی شدت سے بخار چڑھ جاتا تھا۔ اور باہر نکلنے کے لئے ایک آسان راستہ مل جاتا تھا۔

میری پوری ٹانگ سوجن سے پھول کر کُپّا ہو گئی تھی اور درد کی ٹیسوں نے مجھے بے چین کر رکھا تھا اس کے باوجود میں نے ہسپتال جانے کے بجائے ریچھ کے بھٹ میں پڑے رہنے کو ترجیح دی۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ڈاکٹر میری ٹانگ کاٹنے پر مصر تھا۔ مجھے ریچھ کے بھٹ میں ڈال کر سنتری قہقہے لگاتے ہوئے چلے گئے تھے اور میں اذیت کی وجہ سے دانتوں سے ہونٹوں کو چبا رہا تھا لیکن چند دن کے بعد میری ٹانگ کی سوجن آپ ہی آپ ختم ہو گئی اور آٹھ دن کے اندر اندر میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔

شروع شروع میں مجھے تنہائی بالکل نہیں کھلی، میں ابھی تک پرامید تھا اور خیال ہی خیال میں اپنے کو فرار ہوتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وقت بڑی سست روی سے گزر رہا تھا یہاں تک کہ تنہائی مجھے نگلنے لگی۔

خوش قسمتی سے میں دانت کے درد میں مبتلا ہو گیا اگر میں چاہتا تو دانت کے درد کا بہانہ بھی کر سکتا تھا اور سنتری کے ساتھ اسپتال جا کر دانت نکلوا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ سنتریوں کی موجودگی میں فرار ہونا ناممکن تھا۔ صرف ایک ہی صورت تھی کہ ہسپتال میں پوری رات گزاری جائے وہاں کی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے اور آئندہ کسی موقع پر بھاگ لیا جائے۔ دانت کے درد نے مجھے یہ موقع فراہم کر ہی دیا۔ میرے سوجے ہوئے جبڑے کو دیکھ کر ڈاکٹر نے رات مجھے اسپتال میں گزارنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ سوجن ختم ہونے پر صبح کو دانت نکالا جائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں اس سے کہا۔

"بیٹا صبح تک میں تم سے بہت دور پہنچ چکا ہوں گا!"

آدھی رات کو مجھے فرار ہونے کا ایک موقع مل ہی گیا، اس وقت وارڈ کے دونوں بازوؤں پر محافظوں کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی تھی، چند لمحے، چند سیکنڈ ایسے تھے کہ جب کسی کی توجہ اس طرف نہیں تھی جہاں میں تھا۔ صرف تین سیکنڈ کی بات تھی وارڈ کے بیچوں بیچ صرف ایک مدھم سا بلب روشن تھا جس کی روشنی پورے وارڈ کے لئے ناکافی تھی، میں چپکے سے بستر سے اترا، بالٹی کو ہاتھ میں اٹھایا اور اپنی پوری طاقت سے اسے بلب پر کھینچ مارا۔ ایک پٹاخے کی سی آواز وارڈ میں گونج گئی پھر اندھیرا ہو گیا۔ مکمل اندھیرا، میں پھرتی سے مریضوں کے بستروں کے بیچ سے گزرتا ہوا، قریب ترین دروازے تک پہنچا اور وہاں زمین پر لیٹ گیا، دوسرے ہی لمحے فلیش لائٹ نے وارڈ کو چمکا دیا۔ کچھ محافظ وارڈ کے اندر داخل ہو گئے۔ باہر میدان کھلا پا کر میں آہستہ سے رینگ کر باہر نکلا پھر اٹھ کر سرپٹ ایک جانب بھاگا۔ اور اچانک محافظوں کے ایک دستے کے درمیان گھر گیا۔

فرار کی میری یہ دوسری کوشش بھی ناکام ہو گئی ریچھ کے بھٹ میں میری قید تنہائی میں مزید ایک سال کا اضافہ کر دیا گیا۔ لیکن میں ذرا سا بھی ہراساں نہیں ہوا، وہ میری سزا میں پچاس سال کا اضافہ بھی کر دیتے تو

کونسا فرق پڑتا۔ مجھے تو یہاں رہنا ہی نہیں تھا، مجھے تو ہر حال میں فرار ہونا تھا۔

اسی وقت میرا دانت نکالے بغیر مجھے واپس ریچھ کے بھٹ میں ڈال دیا گیا لیکن ڈاکٹر نے جو انجکشن سوجن کم کرنے کے لئے میرے مسوڑھے میں لگائے تھے ان سے درد جاتا رہا۔

اس کے بعد سات سال میں نے کبھی ریچھ کے بھٹ اور کبھی قید خانے کے اسپتال میں گزارے۔ میں نے سمندر کے راستے ایک لکڑی کے تختے پر تیرتے ہوئے برازیل بھاگنا چاہا لیکن طوفان نے مجھے پھر کنارے پر اچھال دیا۔ میں نے بھاگ کر سمندر ہی کے راستے جزائر غرب الہند کا رخ کیا اور مسلسل تین ہفتوں تک طوفانی موجوں سے لڑتا ہوا ایک برطانوی جزیرے سے جا لگا، لیکن برطانوی حکام نے مجھے واپس شیطانی جزیرے بھیج دیا۔ ریچھ کے بھٹ، اسپتال اور فرار۔ سات سال تک مستقل زندگی اسی محور کے گرد گھومتی رہی۔ ۲۷ بار میں فرار ہوا اور ہمیشہ تنہا اور ہمیشہ ناکام لیکن میں ہمت نہ ہارا البتہ میں نے سوچا کہ یہاں سے تنہا بھاگنا ممکن نہیں ہے۔ اور اپنے ساتھ دوسروں کو شریک کئے بغیر کام نہیں چلے گا۔

اٹھائیسویں بار میں نے چھ دوسرے قیدیوں کو ساتھ لیا، ایک اسپتال سے اور پانچ قید خانے کا کوڑا کرکٹ ڈھونے والے قیدی۔ اس بار بھی میں نے اسپتال ہی سے بھاگنے کی کوشش کی۔

اس بار میں نے اپنے ایک پیر اور ایک بازو میں زخم لگائے، زخم کیا ناخنوں سے کھال کھرچ کر گوشت پر خوب گندگی ملی، کئی روز تک میں ان زخموں پر گندگی اور غلاظت ملتا رہا نتیجتہً بازو اور پیر پر پھوڑے ابھر آئے۔ ایک روز میرے بازو کی حالت بہت خراب ہو گئی اور سوجن تمام ہاتھ پر پھیل گئی تو سنتری مجھے بھٹ سے نکال کر اسپتال لے گئے، زخم کے زور سے مجھے بخار بھی چڑھ آیا تھا۔

میں اسپتال میں داخل ہوا تو تمام مریض اپنے بستروں میں اٹھ اٹھ کر بیٹھ گئے ایک عادی مفرور کی حیثیت سے میں تمام قیدیوں میں مشہور ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر نے میرے بازو میں نشتر سے شگاف ڈال کر تمام مواد خارج کر دیا اور وہاں گندھک کا پاؤڈر بھر دیا۔ اس کے بعد مجھے ایک بستر دے دیا گیا کیونکہ دن میں کئی بار زخم کو صاف کرنے کی ضرورت تھی، کمزوری کی وجہ سے مجھے جاڑے بخار نے بھی آگھیرا تھا اور میں بستر پر پڑا ہوا بری طرح کپکپا رہا تھا، میرے بستر کے ایک طرف دوسرے پلنگ پر ایک قیدی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور دوسری طرف خوفناک ژاں آرتو تھا۔ ژاں آرتو کا نام "خوفناک" اس لئے پڑ گیا تھا کہ اس نے لاتعداد انسانوں کو بڑی شقاوت سے قتل کیا تھا اور شیطانی جزیرے پر اس سے بڑا کوئی دوسرا قاتل موجود نہ تھا، اس کو اپنے قریب دیکھ کر قیدی خوف سے تھرانے لگتے تھے، قید خانے میں بھی اکثر و بیشتر قیدی قتل ہوتے رہتے تھے، خوفناک ژاں نے یہاں بھی بے شمار قیدیوں کو قتل کیا تھا، لیکن قید خانے کے حکام قتل کے ان واقعات کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ وہ یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ ایک اور قیدی سے پیچھا چھوٹا، لیکن اگر ایک سنتری قتل کر دیا جاتا تھا تو قاتل کو فوراً ہی گلوٹین کر دیا جاتا تھا، ایک سیکنڈ میں قاتل کا سر دھڑ سے علیحدہ ہو جاتا تھا اور اس کا جسم دیر تک زمین پر پھڑکتا رہتا تھا۔ اس کے بعد مردہ دھڑ اور سر کو سمندر میں رہنے والی خونخوار شارک مچھلیوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

قیدیوں میں مشہور تھا کہ خوفناک ژاں نے شیطانی

جزیرے پر کئی محافظوں کو بھی قتل کیا تھا لیکن اس کے خلاف کبھی کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکا اور وہ قید خانے میں ہر طرف دندناتا پھرتا تھا، مجھے خوفناک ژاں کو اپنے پاس دیکھ کر خوشی ہوئی، میں نے سوچا کہ اگر اس آدمی کو میں اپنے ساتھ ملالوں تو پھر کامیابی یقینی ہے، میں اپنے ساتھ ایسے ہی قیدیوں کو رکھنا چاہتا تھا جو بے انتہا نڈر اور طاقتور ہوں، میں نے خوفناک ژاں سے پوچھا۔

"کیا تم زیادہ بیمار ہو ــــ؟"

"معدے میں السر ہو گیا ہے ــــ کیوں کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیا تم سفر کر سکتے ہو؟۔"

"سنا تو یہ ہے کہ سفر سے السر کو فائدہ پہنچتا ہے۔" خوفناک ژاں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"اگر میں یہاں سے فرار ہونا چاہوں اور برازیل کا رُخ کروں تو تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے؟"

"تمھیں معلوم ہے کہ ان گنجان جنگلوں اور پہاڑوں سے گزر کر کوئی شخص زندہ سلامت برازیل نہیں پہنچ سکا ہے۔"

"میں چار بار ان جنگلوں اور پہاڑوں کو چھان چکا ہوں" میں نے جواب دیا "ممکن ہے ہم اس راستے برازیل نہ پہنچ پائیں لیکن یہی ایک ایسا راستہ ہے جس پر سنتری ہمارا تعاقب نہیں کریں گے۔ میں تمام راستوں سے فرار ہونے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن ایک بھی ــــ"

میں اچانک خاموش ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک راستہ ایسا بھی ہے جسے میں نے اب تک نہیں آزمایا ہے۔ اس بار اسے بھی آزما لیا جائے۔

پھر میں نے خوفناک ژاں کو فرار کا تمام منصوبہ سمجھایا اور ژاں نے اس سے مکمل اتفاق کیا۔ منصوبہ کچھ ایسا تھا کہ اس

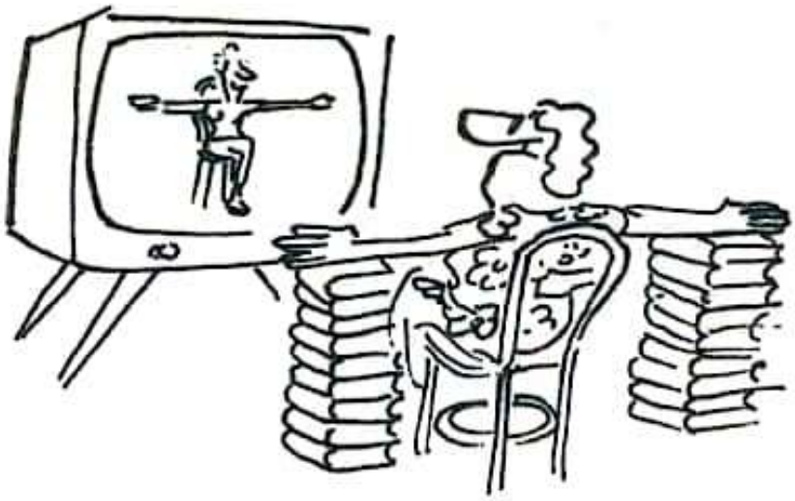

میں ہمارے ہلاک ہو جانے کا بھی اندیشہ تھا لیکن آزادی کے حصول کے لئے اس قسم کے خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں محافظوں کو یہ احکام تھے کہ جس کسی کو بھی بھاگتے ہوئے دیکھیں بے جھجک گولی مار دیں۔

ہر روز شام ہونے سے کچھ پہلے کچرا ڈھونے والا ٹرک اسپتال سے کوڑا کرکٹ اٹھانے آتا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اور اس کا کلینر دونوں قیدی ہی تھے۔ البتہ رائفلوں سے مسلح دو سنتری اس پر سوار رہتے تھے۔ مجھے اس ٹرک کی ضرورت تھی، مجھے یقین تھا کہ ڈرائیور اور کلینر بھی ہمارے ساتھ ہی فرار ہونا چاہیں گے۔

دن کے وقت مریضوں کو وہ بیت الخلا استعمال کرنے کی اجازت تھی جو اسپتال کے دونوں سروں پر تھے لیکن رات کو رفع حاجت کے لئے انھیں بالٹیاں فراہم کی گئی تھیں وارڈ کے دونوں بازوؤں پر ایک ایک مسلح سنتری پہرہ دیتا تھا۔

جب باہر ٹرک رُکنے کی آواز آئی تو میں نے ژاں سے کہا، "سنو ژاں۔ میرے اشارے کا انتظار کرنا اور پھر فوراً ہی کام شروع کرنا ہے۔"

وہ اٹھ کر فوراً ہی ایک سرے پر واقع بیت الخلا کی طرف چلدیا اور جب وہ وہاں پہنچ گیا تو دوسرے بیت الخلا کی طرف

میں چل پڑا۔

اندر پہنچ کر میں نے ایک سیکنڈ توقف کیا اور پھر زور زور سے چلانا شروع کر دیا "مدد، مدد، مار ڈالا ــــ"

اکثر اوقات بیت الخلا ہی میں قیدی قتل ہوتے تھے اور محافظوں کو بھی اس بات کا اچھی طرح پتا تھا۔ میرے قریب جو سنتری کھڑا تھا وہ دوڑ کر میرے پاس دیکھنے آیا کہ کیا ماجرا ہے ــ اور تقریباً اسی وقت دوسرے سرے پر کھڑے ہوئے سنتری کے چلانے کی آواز آئی، میری طرف بھاگتے بھاگتے سنتری ٹھٹک کر پیچھے دیکھنے لگا، اسی موقع کا مجھے انتظار تھا، میں نے پوری قوت سے اس پر چھلانگ لگاتے ہوئے ایک ہاتھ اس کی گردن پر مارا اور دوسرے سے رائفل پکڑ لی، سنتری تو زمین پر ڈھیر ہو گیا، اور میں رائفل ہاتھ میں تھامے تھامے دوڑ کر باہر نکل آیا۔ دوسرے سرے سے خوفناک ژاں دوڑتا ہوا آ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔

دونوں جانب سے ہم نے ٹرک پر سوار سنتریوں پر اپنی رائفلیں چھتیا لیں اور ڈانٹ کر کہا کہ انھوں نے ذرا سی بھی جنبش کی تو ہم دونوں کو ایک سیکنڈ میں بھون کر رکھ دینگے

سنتری خوفناک ژاں سے بُری طرح خائف تھے۔

"اپنی رائفلیں وہیں پھینک دو" میں نے کہا "ہمیں صرف ٹرک کی ضرورت ہے تمھاری نہیں"

انھوں نے اپنی رائفلیں ٹرک میں کچرے کے ڈھیر پر ڈال دیں اور ٹرک سے اتر آئے۔ میں ڈرائیور کی ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا، رائفل میرے ہاتھ میں تیار تھی اور ژاں کلینر کے ساتھ ٹرک کے اوپر بیٹھ گیا تھا۔

"چلو میرے دوست" ــ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "ہمیں پھاٹک کے پرخچے اڑاتے ہوئے تیزی سے گزر جانا ہے"

ٹرک نے جلد ہی رفتار پکڑ لی اور لکڑی کے دروازے کو توڑتے ہوئے باہر نکل آیا، وہ بڑا ہوشیار ڈرائیور معلوم ہوتا تھا لیکن وہ اب تک بالکل خاموش تھا اور اس کی نیت بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس سے کہا "بالکل سیدھے چلنا، ورنہ تمھاری لاش زمین پر پھڑکتی نظر آئے گی"

دوسرا اور بڑا پھاٹک اب صرف پچاس گز دور رہ گیا تھا، میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"اگر ہم بخیر و خوبی اس سے گزر جائیں تو فوراً ہی داہنے ہاتھ کو موڑ لینا اور سیدھے وہاں کا رخ کرنا جہاں کچرا ڈھیر کیا جاتا ہے ــ سمجھے؟"

پھاٹک تک ہم گولیاں برساتے ہوئے پوری رفتار سے محافظ پناہ لینے کے لئے کونوں کھدروں کی جانب بھاگے اور ہم دروازے کو توڑتے ہوئے اطمینان سے باہر نکل آئے ڈرائیور نے ٹرک داہنے ہاتھ کی طرف موڑ لیا اور کچرے کے ڈھیروں کا رُخ کیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"بغیر کہیں رُکے بالکل سیدھے چلنا، ٹرک وہاں رُکے گا جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بالکل

نہیں۔ سُن لیا کان کھول کے؟،،

"کیا تم وہاں مجھے چھوڑ دو گے؟،، اس نے پوچھا "مجھے اور کلکو کو؟،،

میں نے اُسے غور سے دیکھا، ہر قیدی شیطانی جزیرے سے بھاگنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ بعض تو یہ جگہ پسند کرتے ہیں، اور اس کی وجوہ ہیں مثلاً یہی ڈرائیور تھا اسے صرف کچرے کا ٹرک چلانا پڑتا تھا۔ کھانے کو دبا کے ملتا تھا اور ایک لڑکا کلینر کی حیثیت سے اس کے بہت سے کام کرتا رہتا تھا۔ میں نے اُس کا سوال سُنا ان سُنا کر دیا کچرے کے ڈھیر بالکل سامنے تھے اور ڈرائیور اب واقعی پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"میں تمھیں ایک بڑا اچھا راستہ بتا دوں گا" اس نے لجاجت سے کہا "اور ساتھ ہی ایک ہزار فرانک کی رقم بھی تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

"بھاڑ میں جائے تمھاری رقم اور تمھارا راستہ" میں نے ڈپٹ کر کہا "بس اس طرح میں نے کہا ہے گاڑی چلاتے رہو۔ جنگل میں فلاں کیا میں بھون کر کھاؤں گا؟"

کچرے کے ڈھیروں پر بھی سنتری تعینات تھے، ہم پچاس گز دور ہی سے گولیاں برسانے لگے تاکہ کوئی سنتری ہلاک یا زخمی نہ ہو اور اسے اِدھر اُدھر بھاگنے کا موقع مل جائے، میں نے خوفناک ژاں کو تنبیہہ کر دی تھی کہ کوئی محافظ ہلاک نہ ہو، ورنہ انسان سے سرکٹا بننا پڑے گا۔ ہماری گولیوں کی بارش نے سنتریوں کو تتر بتر کر دیا۔ انھوں نے بھی کہیں کہیں اوٹ لے کر ہم پر گولیاں برسائیں لیکن وہ اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ ایک بھی گولی ٹرک پر نہ پڑی البتہ اس افراتفری میں وہاں کام کرنے والے بہت سے قیدی بھاگ کھڑے ہوئے۔

ڈرائیور نے جنگل سے صرف دس گز کے فاصلے پر ٹرک روک دیا، میں ٹرک سے اُتر آیا، اور خوفناک ژاں بھی تین رائفلیں اپنے ہاتھوں پر سنبھالے نیچے اُتر آیا۔ چند لمحوں بعد ہم جنگل میں تھے، پتا نہیں ٹرک ڈرائیور اور کلینر پر کیا گزری لیکن میرا خیال ہے وہ قید خانے لوٹ گئے ہوں گے۔

جنگل کے اندر اندر ایک میل چلنے کے بعد میں اور ژاں رُک گئے، ہمیں پیچھے جھاڑیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم دونوں درختوں کی اوٹ میں چھپ کر اپنا تعاقب کرنے والوں کو دیکھنے لگے، رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تیار تھیں اور ہم سوچ رہے تھے کہ یہ سنتری ہیں یا پھر مفرور قیدی۔

ہم نے دیکھا کہ جھاڑیوں میں سے آگے پیچھے پانچ قیدی نمودار ہوئے، وہ لڑکھڑا رہے تھے اور بھاگنے سے اُن کے سینے دھونکنی کی طرح چل رہے تھے، خوفناک ژاں نے ایک رائفل اپنے پاس روک کر باقی دو ان قیدیوں میں سے دو کو دیدیں ایک کے ہاتھوں میں پھاوڑا تھا اور باقی دو، کدالیں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تھے۔

اب سات مسلح آدمیوں پر مشتمل ہمارا قافلہ جنگل میں چل پڑا۔ جب تک روشنی نے ہمارا ساتھ دیا ہم آگے بڑھتے رہے جب اندھیرے میں آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تو ہم نے درختوں کی شاخوں میں پناہ لی۔ میرے بازو کے زخم میں اب مستقل ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، میں پریشان ہونے لگا۔ ماضی میں کئی بار ایسا ہوا تھا کہ فرار ہو جانے کے باوجود زخموں نے مجھے قید خانے میں لوٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا پھر مجھے نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو بازو میں درد برائے نام رہ گیا تھا، شاید قدرت مجھ پر مہربان تھی۔

ہم سب نحیف و ناتواں تھے، پیچش، بخار اور ناقص غذا نے ہمیں گھلا دیا تھا بس ہم تو چلتے پھرتے ہڈیوں کے ڈھانچے رہ

گئے تھے، اگلی صبح جب ہم سو کر اٹھے تو صرف چھ قیدیوں کو پایا۔ ہمارے ساتویں ساتھی کی پناہ گاہ خالی پڑی تھی ہم میں سے کسی نے بھی رات میں کوئی آواز کوئی چیخ کوئی سرسراہٹ نہیں سنی تھی، بس بندروں کی خیخیاہٹ طوطوں کی ٹیں ٹیں اور چیتوں کے دہاڑنے کی آوازوں نے کبھی کبھی خاموش رات کو جھنجھوڑا تھا اگر کسی درندے نے ہمارے ساتویں ساتھی کو ہلاک کیا تھا تو گہری نیند میں ہلاک کیا ہوگا اور خاموشی سے لاش کو گھسیٹ لے گیا ہوگا۔ اس کی رائفل بھی غائب تھی، یا ممکن ہے وہ خود ہی چپکے سے کھسک لیا ہو اور کسی چیتے کا شکار ہو گیا ہو، یا شاید کسی سانپ نے اُسے ڈس لیا ہو۔

بہرحال ہم نے تلاش میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ غذا کا حصول ہمارے لئے اب ایک مسئلہ بن گیا تھا، ایک جگہ چند جنگلی پھل ہمیں دستیاب ہوئے تو مُر بھکوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے، پیٹ تو بھر گیا لیکن بھوک کا احساس باقی رہا۔ شام ہوتے ہوتے ہم جنگل کو پار کر کے اونچے نیچے پہاڑوں کے ایک طویل سلسلے میں نکل آئے تھے۔ اب جنگلی پھل ملنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا، اب تو بس یہی ایک صورت تھی کہ کوئی چرند یا پرند مل جائے تو اُسے شکار کریں اور کھالیں لیکن شکار بھی اِن پہاڑیوں پر نایاب تھا۔

شام کی مٹیالی روشنی ابھی اندھیرا نہیں بنی تھی کہ ایک طوطا ہمیں نظر آ گیا، جو میری رائفل کی ایک ہی گولی سے چشم زدن میں قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ لیکن ایک طوطے کا بدذائقہ گوشت اور چھ آدمی، جیسے اونٹ کی داڑھ میں زیرہ تھا۔ اس وقت ہمیں ساتویں آدمی کی کمی بڑی خوشگوار محسوس ہوئی، کاش اس سے بھی کم لوگ ہوتے تو چھٹانک آدھ چھٹانک گوشت زیادہ ہی ہمارے حصہ میں آجاتا۔

اگلے دن صبح جب ہم سو کر اٹھے تو پانچ آدمی رہ گئے تھے اور اس کے اگلے روز صرف چار۔ اور غذا کی قلت کی وجہ سے یہ چار بھی اب زیادہ معلوم ہو رہے تھے۔

اس رات ہم چیل کے درختوں کے کنج میں سوئے تھے۔ زمین پر پڑی ہوئی چیل کی پتیاں کمر میں سوئیوں کی طرح سے چبھ رہی تھیں۔ لیکن نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ ہم بھی سو گئے۔ اگلی صبح ایک اور ساتھی غائب تھا، اور اس کے ساتھ ایک اور رائفل بھی۔ اب ہمارے پاس دو رائفلیں رہ گئی تھیں ایک میرے پاس اور دوسری خوفناک ژاں کے پاس۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اگر ہمارے ساتھی کو کوئی حادثہ پیش آیا تھا تو اسے کم از کم کچھ چیخنا چلانا بھی چاہیے تھا، پتا نہیں وہ کسی لکڑ بھگے کا لقمہ بنا یا کسی پہاڑی شیر کا۔ بہرصورت وہ تھوڑا بہت چلا کر ہمیں باخبر تو کر سکتا تھا۔ ہم نے سوچا ممکن ہے وہ رات کو کہیں اٹھ کر چلا گیا ہو اور کسی پہاڑی کھڈ میں گر گیا ہو۔

اگرچہ اس حادثے کے متعلق کسی نے کچھ بھی نہیں کہا لیکن ایک خدشہ ہمارے دلوں میں اُبھر رہا تھا، ہر شخص شاید یہ سوچ رہا تھا کہ ان حادثوں میں کہیں خوفناک ژاں کا ہاتھ تو نہیں۔ بہرحال میں نے یہ طے کر لیا کہ آج رات کو اور ہر رات کو بہت ہی ہلکی نیند سویا کروں گا۔ اور اپنی رائفل اپنے ساتھ کسی جوان لڑکی کی طرح چمٹا کر رکھوں گا۔

اس روز ہمیں بھوک نے تو زیادہ پریشان نہیں کیا لیکن پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑ گئے، اندھیرا ہوتے ہوتے ہماری زبانیں چٹخنے لگی تھیں اور قدم بری طرح لڑکھڑانے لگے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ جھاڑیوں میں ہم سونے

کے لئے لیٹ گئے۔ میرے ذہن سے اپنے دو ساتھی بھی نکل چکے تھے جنھیں جنگل اور پہاڑوں نے نگل لیا تھا۔

میں تھکن سے چور چور تھا اور بھوک اور پیاس سے بے چین، سویا تو ایسے گھوڑے بیچ کر کہ صبح کو آنکھ کھلی، ناتوانی نے سب ہی کو گہری نیند سلا دیا تھا۔ اب ہم صرف چار ساتھی رہ گئے تھے، اور ہم چاروں میں بھی صرف خوفناک ژاں اور مجھ میں کچھ توانائی باقی رہ گئی تھی، چنانچہ ہم دونوں نے اپنے ایک ایک ساتھی کو سہارا دے کر سفر جاری رکھا۔

راستے کی صعوبتوں کو ژاں نے بھی اتنا ہی جھیلا تھا جتنا اور سب نے۔ پھر بھی وہ ہم سب کے مقابلے میں زیادہ توانا و تندرست نظر آتا تھا، بلکہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ جب ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا اس وقت ژاں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور تھا یوں لگتا تھا کہ جیسے اس نے کوئی فاقہ ہی نہیں کیا ہو۔

میرے ذہن میں ایک ہولناک خیال نے سر ابھارا۔ "کہیں ہمارے تین غائب ہو جانے والے ساتھی خوفناک ژاں کا لقمہ تر تو نہیں بن گئے۔ ممکن ہے ژاں نے ان کو قتل کر کے ان کا کچا گوشت چبا لیا ہو اور ان کے زخموں پر منہ رکھ رکھ کر خون چوسا ہو۔ لیکن میں خاموش رہا، اس سلسلے میں کچھ بھی کہنا خود اپنی اجل کو دعوت دینا تھا، میں نے تصور ہی تصور میں ژاں کو اپنا گوشت بھنبھوڑتے اور اپنا خون پیتے ہوئے دیکھا۔ خوف سے مجھے جھرجھری آگئی میں نے طے کیا کہ اب ژاں پر کڑی نگاہ رکھوں گا۔ اگر میرا خیال سچ ثابت ہوا تو پھر میں ایک ہی گولی سے اس کا بھیجا اڑا دوں گا۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ یہ خیال صرف میرے ہی ذہن میں نہیں تھا۔ میرے باقی دو ساتھی بھی یہی کچھ سوچ رہے تھے۔

جس آدمی کو خوفناک ژاں نے سہارا دے رکھا تھا

وہ اچانک اس کو دھکا دے کر علیحدہ ہوا۔ ناتوانی سے گھٹنوں کے بل زمین پر گرا اور بہ مشکل کدال اپنے ہاتھ میں سنبھال کر کہنے لگا۔

"خبردار جو مجھے چھوا حرامی بچے" اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا "دور ہٹ میرے پاس سے آدم خور، ورنہ اس کدال سے تیرا بھیجا پاش پاش کر دوں گا۔"

ژاں کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے، آنکھوں سے نفرت کا لاوا پھوٹا، پھر اچانک اس نے رائفل چھتیائی، ایک دھماکا ہوا اور گولی گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے ساتھی کے سینے کو توڑتی ہوئی پار نکل گئی۔

میرے شک کو یقین میں بدلنے کے لئے یہ واقعہ کافی تھا، خوفناک ژاں آدم خور تھا، اب صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی، میں نے اپنی رائفل تانی اور پھر دوسرے ہی لمحے ژاں اچھل کر دو قدم پیچھے گرا۔ گولی نے اس کے بھیجے کو

اڑا دیا تھا۔

اب صرف ہم دو افراد رہ گئے تھے، میں اور میرا وہ ساتھی جسے میں نے اب تک سہارا دیا ہوا تھا، میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب مزید خون خرابے کی گنجائش نہیں تھی جتنا ہوا یہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن اچانک میری نگاہ اپنے دوسرے ساتھی پر پڑی وہ ژاں کی رائفل اٹھانے کے لئے بڑھ رہا تھا، دہشت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں، وہ چلا رہا تھا۔

"اس سے پہلے کہ تم مجھے مارو، میں تمہیں مار ڈالوں گا۔"

اس نے رائفل اپنے ہاتھ میں دبوچ لی اور تیزی سے پلٹا لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا میری رائفل نے شعلہ اگلا اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا، مجھے اپنی طبیعت خراب ہوتی ہوئی محسوس ہوئی، میرے گھٹنے کپکپا رہے تھے، اپنے چاروں طرف خون ہی خون دیکھ کر یکایک مجھے متلی ہو گئی۔ کمزور اور پژمردہ میں ایک درخت کا سہارا لے کر بیٹھ گیا میں نے خوفناک ژاں کو قتل کیا تھا، اس لئے کہ وہ آدم خور تھا اس لئے کہ اس کی موت میں خود میری بقا تھی، لیکن یہ دوسرا شخص، اسے میں نے کیوں قتل کیا، کاش وہ اپنے ذہن کو قابو میں رکھتا، کاش وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں ہوتا، کاش وہ رائفل اٹھا کر مجھے مارنے کی کوشش نہیں کرتا تو پھر میں تنہا نہیں رہ جاتا، میں اس کے ساتھ اور وہ میرے ساتھ ہوتا اور ایک دوسرے کے سہارے سفر ہمارے لئے کتنا آسان ہو جاتا مگر موت اس کا مقدر بن چکی تھی، اور میرے ہاتھوں جو اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے۔

آئندہ چند روز میں نے جس طرح گزارے ان کا ایک ہلکا سا نقش ذہن پر رہ گیا ہے، مجھ پر دہشت سوار تھی اور میں یونہی بے مقصد پھر رہا تھا، کہیں جھاڑیاں کہیں پتھر، ہموار پگڈنڈیاں اور ناہموار چٹانیں۔ بلندیاں اور گھاٹیاں میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا رہا، گرتا رہا اور سنبھلتا رہا اور پھر ایک روز میں نے خود کو ایک عظیم کھڈ کے سامنے پایا۔ ایک عظیم کھڈ جو حد نگاہ تک انگڑائی لے رہا تھا۔ اس سے پرے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں تھیں اور نیچے وادیوں میں بکھرا ہوا نیلگوں غبار، میں حوصلہ ہار گیا۔ میں نے شکست قبول کر لی۔

واپس ہوا تو میں نے اپنے جسم کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کو چٹختے ہوئے محسوس کیا۔ لیکن گرتا پڑتا وہاں تک پہنچ ہی گیا جہاں تین لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ لکڑ بھگے ان کے بازوؤں پنڈلیوں، اور سینوں کو چبا رہے تھے، میں چیختا ہوا ان لاشوں کی طرف لپکا۔ مجھے دیکھ کر لکڑ بھگے اپنے خون سے لتھڑے منہ زبانوں سے چاٹتے ہوئے جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

چند روز بعد جب میں شیطانی جزیرے کی حدود میں داخل ہوا تو لوگ کہتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں ایک انسانی ران کی ہڈی تھی، جس پر لگا ہوا گوشت میں بہت کچھ چبا چکا تھا اور جو رہ گیا تھا وہ دانتوں سے بھنبھوڑ رہا تھا اور میں پاگل تھا، میرا لباس تار تار تھا اور چہرے اور سر کے بالوں کے درمیان آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں، لوگ کہتے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں۔

مجھے پھر ریچھ کے بھٹ میں ڈال دیا گیا۔ مدتوں میں خود کو جنگلوں اور پہاڑوں میں انسانی لاشوں کے درمیان سمجھتا رہا لیکن ایک روز اچانک جنگل، پہاڑوں اور ویرانوں کے سائے میرے ذہن سے نکل گئے اور میں نے خود کو پتھریلی دیواروں اور لوہے کے جنگلے کے درمیان ریچھ کے بھٹ میں پایا، میں ننگا تھا، میرا جسم خون اور گندگی میں لتھڑا ہوا تھا اور مجھے

ہوئے بالوں میں جوئیں سرسرا رہی تھیں میں نے چلّا کر کہا
"کوئی ہے، مجھے پانی چاہیئے۔"
ایک محافظ دوڑتا ہوا آیا، جنگلے میں سے جھانک کر اس نے
مجھے دیکھا اور ایک طویل قہقہہ لگایا۔
"آخاہ، آدم خور کو بھی پانی کی ضرورت ہوگئی۔؟"
"جب تمھارے قہقہے تھم جائیں" میں نے کہا "اور تمھارے
ترکش میں طعن و تشنیع کے تیر ختم ہو جائیں تو مجھے ایک بالٹی
پانی بھجوا دینا، میں واقعی نہانا چاہتا ہوں۔"
وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا اور گھور گھور کر مجھے دیکھنے لگا۔
پھر غصے سے بولا۔
"اچھا! تو پھر تو ہوش میں آگیا آدم خور کے پلے، تیرا
دماغ تو ٹھیک ہے؟"
"ہاں! سب ٹھیک ہے، پانی لاؤ۔"
وہ چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر میں مجھے ایک بالٹی
پانی مل گیا، مجھے یاد نہیں کہ میں کس کے خون میں لتھڑا ہوا
تھا البتہ یہ سب کا سب خون میرا اپنا خون نہیں تھا، میرے
جسم پر کہیں کہیں کانٹوں نے خراشیں ڈال دی تھیں یا
سوکھی ٹہنیوں سے پڑ جانے والا ایک آدھ زخم تھا۔
نہا دھو کر مجھے قدرے سکون محسوس ہوا اور میں اپنے
آئندہ فرار کے منصوبے بنانے لگا۔ ضروری نہیں کہ ۲۸ بار
ناکام ہونے کے بعد میں ۲۹ ویں بار بھی ناکام ہی رہوں۔
اچانک میری کوٹھری کا جنگلا کھلا، ایک محافظ نے
مجھے باہر بلایا، پہلے اس نے مجھے ایک جوڑا صاف کپڑوں کا
پہننے کے لئے دیا اور پھر کمانڈر کے دفتر میں لے گیا۔
دیوار پر لٹکا ہوا ایک کیلنڈر ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ بتا رہا تھا
اس کی میز پر ایک ماہ پرانا پیرس کا ایک اخبار پڑا تھا جس
میں جنگ کا احوال درج تھا۔ بوڑھا کرنل وردی پہنے تھا، شراب

نے اس کے رخساروں کو اور دہکا دیا تھا،
"کاربیرے" اس نے کہا "تم نے اپنے آئندہ فرار کا
منصوبہ بنایا کہ نہیں؟"
"ابھی تو نہیں کرنل" میں نے جواب دیا۔
"تمھیں پتا ہے" اس نے کہا "قیدی تمھیں اب آدم خور کے
نام سے پکار رہے ہیں اور اگر تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ
تمھاری تکا بوٹی کر کے رکھ دیں گے۔" ایک لحظہ توقف کے
بعد اس نے پھر کہا "اس قید خانے کو ایک جلاد کی ضرورت
ہے، تم یہ کام کر سکو گے؟"
"میں ہی کیوں؟" میں نے پوچھا
کمانڈر مسکرایا "اس کام کے لئے ایک آدم خور سے بہتر
اور کون ہو سکتا ہے؟"
مجھے معلوم تھا کہ مجھے جلاد بنانے کے لئے جو وجہ بتائی
گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ اس کی اصل وجہ مجھے فرار ہونے سے روکنا
تھا، ریچھ کے بھٹ سے نکل کر کم از کم اسپتال تو پہنچا جا سکتا
تھا لیکن ایک بار جلاد بننے کے بعد پھر موت ہی چھٹکارا دلا سکتی
تھی۔
شیطانی جزیرے کا جلاد ہمیشہ کوئی نہ کوئی قیدی ہی ہوتا
تھا، اور وہ رایل جزیرے کے پرلے سرے پر تنہائی کی زندگی
گزارتا تھا، اسے دوسرے قیدیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے
خاص انتظامات کئے جاتے تھے، مسلح سنتری ہر وقت اس کی نگرانی
کرتے تھے، موجودہ حالات کے تحت جلاد کے لئے میرا انتخاب
دراصل میری خوش قسمتی تھی، ورنہ قیدیوں کو موقع مل جاتا تو
واقعی وہ کوٹ کوٹ کر میرا قیمہ بنا دیتے۔
میں کرنل کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔ دل ہی دل
میں میں نے اس کی چالاکی کو سراہا۔ شیطانی جزیرہ پر صرف
یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے فرار ہونا کسی کے لئے بھی۔

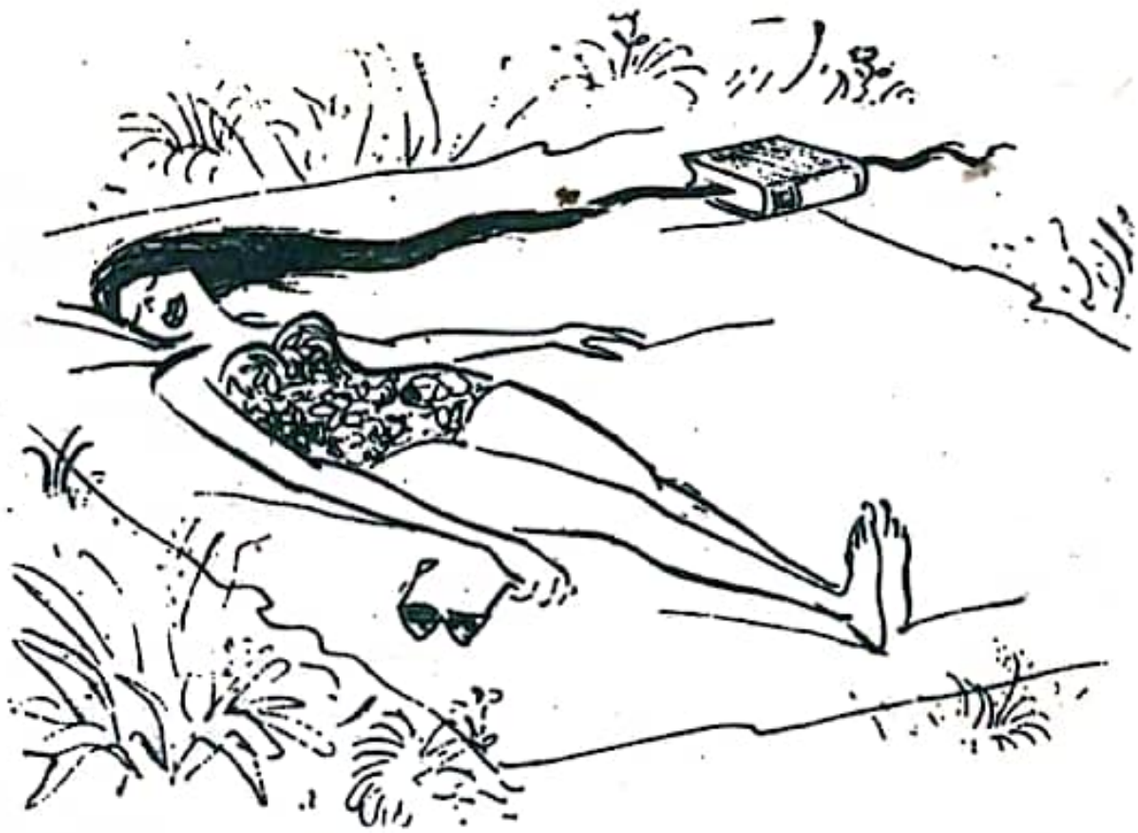

ناممکن تھا، لیکن وہ جو مثل مشہور ہے، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے وہ بھی ٹھیک ہی ہے۔

میں پرانے جلاد سے ملا۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی محافظوں نے اس کا تعاقب کیا تو اس نے ایک محافظ کو جان سے مار دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کی سزا موت تھی۔ قید خانے کے جس گلوٹین پر وہ اب تک دوسروں کا تن سر سے جدا کرتا رہا تھا وہی گلوٹین اب اُس کے خون کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ... گلوٹین جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، جہاں موت کی سزا پانے والے کے سر اور ہاتھوں کو لکڑی کے شکنجے میں اس طرح کس دیا جاتا تھا کہ سوائے پیروں کے وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو جنبش بھی نہیں دے سکتا تھا اور سُتلی کو ایک ہلکا سا اشارہ دینے پر اوپر سے پانچ من کا برچھا اس کی گردن پر گرتا تھا سر دھڑ سے کٹ کر ایک طشت میں گر پڑتا تھا اور چوبی شکنجے میں کسے ہوئے جسم میں ان گنت لرزشیں ہونے لگتی تھیں۔

جلاد کی کوٹھری ایک مضبوط چہار دیواری کے اندر تھی جس کو پھلانگ کر نکل جانا ناممکن تھا۔ اس احاطے میں کوٹھری کے سامنے گلوٹین نصب تھی۔ پرانا جلاد جس کا نام جارج یون فلز تھا اپنی کوٹھری میں مقید تھا، کوٹھری کی واحد آہنی سلاخوں والی کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں نے اُس سے بات کی۔ یون فلز نے مجھے برچھا گرانے کی ترکیب بتائی اور جب میں موت کے وار کو اچھی طرح سمجھ گیا تو اُس نے کہا۔

"اب میں مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"کیا مجھے کمانڈر کو پہلے اطلاع کرنی پڑے گی؟" میں نے پوچھا

"پہلے میں چپکے سے تمھیں ایک راز بتا دوں" یون فلز نے کہا "یہاں سے قریب ایک کشتی ہے جسے جھاڑیوں میں چھپا دیا گیا ہے اور جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں ...."

یون فلز نے اس جگہ کا پورا پتا مجھے سمجھایا اور پھر کہنے لگا۔

"لیکن ایک بات ہے، مجھے یقین ہے تم اس کشتی تک کسی حالت میں نہیں پہنچ سکو گے، تم میری ہی طرح گلوٹین پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گے۔ یہی موت مجھ سے پہلے جو جلاد تھا اسے ملی تھی نہ وہ اس کشتی تک پہنچ سکا، نہ میں اور نہ تم ہی وہاں پہنچ

سکو گے...."

یہ کہتے کہتے بون فلز اچانک رک گیا، اس کی آنکھیں جیسے خلا میں کسی چیز پر جم گئیں۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیلی۔ اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا، ایسا قہقہہ جو رُکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں گھبرا کر کھڑکی سے ہٹ آیا۔

---

۱۰ فروری ۱۹۴۰ء کی تاریخ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی، ابھی صبح نہیں ہوئی تھی، بس رات کی چادر میلی سی ہونے لگی تھی۔ دور کسی درخت پر ابھی ایک آدھ چڑیا ہی نے چہچہانا شروع کیا تھا، جب محافظ جارجز بون فلز کو موت کی کوٹھری سے کشاں کشاں لے کر آئے۔ چوبی شکنجے کے پاس پہنچ کر یکایک اس میں جرأت عود کر آئی۔ اس نے آہستہ سے اپنے بازو محافظوں سے چھڑائے اور شکنجے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ پھر اس نے جھک کر اپنی گردن شکنجے کے سوراخ میں رکھ دی۔ میں نے بے دلی سے چوبی تختوں میں آہنی پیچ کسنے شروع کر دیئے تاکہ وہ جنبش نہیں کر سکے۔ میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا، میں چاہتا تھا کہ اس جگہ سے کہیں بھاگ جاؤں، لیکن میں مجبور تھا اور جب شکنجے میں پھنسے پھنسے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"میرے جلاد خدا کرے تم زندہ رہو، سلامت رہو۔"

جیسے میرا دل خون ہو گیا، شکر ہے اس کی آنکھیں زمین کی طرف تھیں اور وہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا ورنہ میں شاید بیہوش ہو جاتا۔ پھر جب میں اپنے کام سے فارغ ہوا اور برچھا دایا ہی چاہتا تھا تو اس نے پھر کہا۔

"میرے دوست ہوشیار رہنا۔ کہیں اگلی بار یہ گلوٹین ہمارے خون سے سُرخ نہ ہو جائے۔"

اس نے ڈوری کو ہلکا سا اشارہ دیا اور پانچ من وزنی برچھا بجلی کی طرح نیچے گرا۔ سر کٹ کر ایک چھناکے سے باسکٹ میں گرا اور گردن کی سکڑتی سمٹتی رگوں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے، دل کی ہر دھڑکن پر خون کی بوچھاڑ باسکٹ میں گرنے لگی، پھر خون ختم ہو گیا لیکن کچھ دیر تک گردن کی نسیں سکڑتی سمٹتی رہیں، ہاتھوں کی مٹھیاں کھلتی بند ہوتی رہیں، رہ رہ کر جسم میں لرزشیں سی دوڑتی رہیں اور پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔

اب میں کمانڈر کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ ۲۸ بار فرار میں ناکام ہونے کی وجہ سے اب تک وہ مجھے ریچھ کے بھٹ میں پھینکتا رہا تھا، لیکن اس بار اس نے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ اس بار اس نے مجھے نہایت دہشتناک اور اذیت دہ سزا دی تھی، جلاد کی کوٹھری کی تنہائی اور ہر وقت گلوٹین پر نظر، یہ بڑی روح فرسا صورتحال تھی، ہر شخص کو قتل کر کے اس کی شکل نگاہوں سے اوجھل نہ کر سکو، تنہائی میں اپنے مقتولوں کو یاد کرو، خوابوں میں ان کے چہرے دیکھو اور بات کرنے کے لئے کسی وجود کو تلاش کرتے رہو اور تڑپتے رہو۔

مارسیلیز میں میں نے جو کچھ کیا تھا، وہ اکثر لوگ کر سکتے ہیں، جنگلوں میں موت کی پگڈنڈیوں میں مجھ سے جو کچھ سرزد ہوا تھا وہ صرف اپنے بچاؤ کے لئے، جینے کے لئے، کیا تھا لیکن جلاد جارجز بون فلز کی موت، اس کے لئے مجھے مجبور کیا گیا تھا، میں نے سوچا، اب میں یہاں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رہ سکتا، مجھے فوراً بھاگ جانا چاہیئے، لیکن کیسے۔؟ ترکیب بھی اچانک میرے ذہن میں آ گئی۔

جلاد کو موت کے گھاٹ اتروا کے سنتری احاطے کے باہر چلے گئے تھے، وہ لہو بہتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور اسے ذہن سے اتارنے کے لئے وہ اب کچھ اچھی اچھی چیزیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اب مجھے سمندر کے سپرد کرنے کے لئے لاش کو لپیٹ

لپاٹ کر تیار کرنا تھا۔

میں نے گلوٹین کے قریب ہی ترپال کو زمین پر بچھا دیا اور لاش کو شکنجے سے نکال کر ترپال پر لٹا دیا، پھر کٹا ہوا سر جسم سے ملا دیا اور ترپال کو بنڈل کی شکل میں لپیٹ دیا، اس کے بعد میں نے پھر ترپال کھولی جو اب خون میں بھیگی ہوئی تھی، میں نے بالٹی سے نیم جما خون بھی ترپال پر لوٹا اور اسے اچھی طرح پھیلا دیا پھر میں نے بون فلز کا مردہ جسم اور سر جلاد کی کوٹھڑی میں بنی ہوئی ایک الماری میں ٹھونس دیا۔ واپس آکر میں ترپال کے ایک سرے پر لیٹا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر لیٹے ہی لیٹے دوسرے سرے تک لوٹتا چلا گیا۔ اب میں پوری طرح ایک بنڈل کی شکل میں ترپال کے اندر لپٹ چکا تھا۔ تقریباً اسی وقت کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی گودی سے موٹر بوٹ آکر لگی، میں ایک لاش کی طرح بے حس و حرکت اپنے اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ مجھ پر ایک گھبراہٹ سی طاری تھی، اسی لمحے ایک آواز آئی۔

"تم دونوں پیروں کی طرف سے پکڑو۔ ہم ادھر سے پکڑتے ہیں لیکن ذرا دھیان رکھنا، کہیں سر نکل کر نیچے نہ گر پڑے، اسے ہاتھ سے پکڑ کر کون اٹھائے گا؟"

جب انھوں نے مجھے اٹھایا تو میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور گردن کو پیچھے کی طرف ڈھلکا دیا۔ میرے سر کے چاروں طرف ترپال پر سب سے زیادہ خون لگا تھا اور اس کی بساند سے متلی سی ہونے لگی تھی، یہ کچھ ایسی ہی سڑاند تھی جیسے مذبح خانے میں آتی ہے۔

گودی تک پہنچنے کے لئے زمین ناہموار تھی، محافظ شاید میرے بوجھ سے تھک گئے تھے۔ اچانک انھوں نے مجھے زمین پر ڈال دیا۔ ایک آواز آئی:

"فکر نہ کرو، لاش کو گرنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

میرے چوٹ تو لگی تھی لیکن میں چپ سادھے پڑا رہا۔ محافظوں نے مجھے پھر اٹھا لیا۔ ایکبار پھر انھوں نے مجھے موٹر بوٹ میں پٹخ دیا۔ میری کہنیوں اور پیٹھ میں چوٹیں آئیں لیکن میں برداشت کر گیا۔ پھر موٹر بوٹ آبنائے کے درمیان گہرے پانیوں کی طرف چلدی۔ مجھے رایل جزیرے کے قریب ہی سمندر میں ڈالا جانا تھا جہاں ان گنت شارک مچھلیاں لاشوں کے انتظار میں جمع رہتی ہیں۔ اس جگہ شیطانی جزیرے کے تمام مردوں کو سمندر کے سپرد کیا جاتا تھا۔

عموماً شارک پیرتے ہوئے آدمی پر حملہ آور نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس کے جسم پر کوئی زخم ہو جس سے خون رس رہا ہو اور جس ترپال میں میں لپٹا ہوا تھا وہ خون میں تر بتر تھی۔

اچانک آواز آئی

"بس ٹھیک ہے، یہاں پھینکدو۔"

چند ہاتھوں نے مجھے اٹھایا اور پھر ایک چھپاکے سے میں سمندر میں جا گرا۔

پانی کے اندر ہی اندر میں نے پھرتی سے خود کو ترپال سے علیحدہ کیا۔ میں سمندر میں کوئی پندرہ فٹ کی گہرائی میں تھا۔ پانی کی سطح سے چھن چھن کر دھوپ نیچے آرہی تھی۔ ان گنت چمکیلی مچھلیاں غول در غول پانی میں چکر لگا رہی تھیں۔ خون میں لت پت ترپال میرے سر کے اوپر کھلی ہوئی تھی، جس کو بے شمار شارک مچھلیوں نے گھیر لیا تھا۔

کافی دور تک میں نیچے ہی نیچے پانی میں تیرتا رہا۔ اور جب میں سانس لینے کے لئے بالکل بیچین ہو گیا تو پانی کی سطح پر ابھرا۔ موٹر بوٹ بہت دور جا چکی تھی اور مجھے دوبارہ غوطہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ساحل پر پہنچکر میں نے اس جگہ کو تلاش کیا جہاں کشتی چھپی ہوئی تھی، جلد ہی مجھے کوکو کے تین درختوں کا وہ خاص جھنڈ نظر آگیا جس کا پتا بون فلز نے مجھے دیا تھا۔ میں نے جھاڑیوں

میں جھانک کر دیکھا تو واقعی ایک کشتی چھپی ہوئی تھی گو یہ کشتی بہت چھوٹی تھی لیکن اسے پاکر میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اے ابوالہول شیطانی جزیرے، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اور خود بھی جھاڑیوں میں چھپ گیا۔

جب سورج ڈوبا، اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تو میں باہر نکلا۔ دن میں نکلنا خطرناک تھا، محافظوں کو میرے غائب ہونے کا پتا کسی وقت بھی چل سکتا تھا۔ اگرچہ اس بات کی امید کم تھی، کیونکہ شیطانی جزیرے کے جلاد کو تنہا ہی کوٹھری میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور اسی وقت اس سے ملنا ہوتا تھا جب کسی کا سر تن سے جدا کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

رات تاریک تھی، میں نے کشتی کھینچ کر پانی میں ڈالی، پتوار اٹھا کر کشتی میں بیٹھا اور اللہ کا نام لیکر چل پڑا۔ اپنے اس ۲۹ ویں فرار کے لئے میرا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گہرے سمندر میں پہنچا جائے اور اس کے بعد برازیل کا رخ کیا جائے۔ چار دن تک میں برابر چپو چلاتا رہا، میرے ہاتھ شل ہو چکے تھے، اس دوران میں نے صرف چند لمحوں کے لئے ہی آنکھیں جھپکائی ہوں گی۔ پانچویں روز مجھے ایک جہاز برازیل کی سمت جاتا ہوا نظر آیا۔ میں فوراً ہی کشتی میں چھپ گیا تاکہ ملاح کشتی کو صرف بہتا ہوا لٹھا سمجھ لیں۔ لیکن میں غلطی پر تھا، مجھے دیکھا جا چکا تھا۔ چند منٹ بعد جہاز مجھ سے کوئی سو گز کے فاصلے پر آکے رک گیا۔

میں کشتی میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور جبھی جہاز پر لہراتے ہوئے برازیلی پرچم پر میری نگاہ پڑی۔ یہ ساحل کی نگرانی کرنے والے محافظوں کا جہاز تھا۔ انھوں نے ایک کرین کے ذریعے مجھے جہاز پر کھینچ لیا۔

میری روداد سن کر جہاز کے کپتان نے کہا۔

"اب تم کوئی فکر نہ کرو، ہم تمھیں فرانس بھیجیں گے اور نہ ہی شیطانی جزیرے پر۔ تم اپنے کو بالکل آزاد سمجھو۔"

بہرحال میں فرانس چلا ہی گیا۔ اس کی دو وجوہ تھیں پہلی تو یہ کہ جنگ زور شور سے جاری تھی اور فرانس اس کے شعلوں میں جل رہا تھا، فرانس میرا ملک، میرا وطن تھا اور میں اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جان دینے کو بھی تیار تھا، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ممکن ہے جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے حکومت مجھے معاف کر دے۔

برازیلی حکومت نے مجھے پروانہ راہداری دے دیا اور میں ایک جہاز پر سفر کرتا ہوا مارسیلیز جا پہنچا۔ یہ مارچ ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا ساحل پر میں نے چند جانے پہچانے چہرے دیکھے۔ لیکن مجھے کوئی بھی نہیں پہچان سکا، میں بالکل بدل گیا تھا۔

میں آزاد فرانسیسیوں میں شامل ہو گیا اور ۱۹۴۵ء تک فرانس کی سلامتی کے لئے لڑتا رہا، لیکن میری اس خدمت سے بھی فرانسیسی حکام کا دل نہیں پسیجا، حکومت نے مجھے دوبارہ شیطانی جزیرے پر بھیجنے کے احکام صادر کر دیئے لیکن اس آڑے وقت پر میرے چند ساتھی میرے کام آئے انھوں نے مجھے چھپا کر فرانس کی سرحد سے باہر نکال دیا اور یہ میرا انیسواں اور آخری فرار تھا۔

میں سیدھا میکسیکو پہنچا، میکسیکو نے مجھے پناہ دی اور میں ریاست ویراکروز کی قدیم فرانسیسی بستی سان انیل میں بس گیا۔ میرے میکسیکی دوست یہاں مجھے سرجیو کوئیرو کے نام سے پکارتے ہیں، فرانسیسی دوست سرج کاریرے کہتے ہیں۔ تاہم میں خوابوں میں اب تک جنگل اور ویرانے اور طویل پہاڑی سلسلے دیکھتا ہوں جہاں ان گنت آوازیں "آدم خور ــــ آدم خور" چلاتی رہتی ہیں۔

Zegham imran